(گزشتہ سے پیوستہ)

تذکرۂ انبیاء

علیہم السلام

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور

باب اوّل ——— قصۂ آدم علیہ السلام

فصل ۷، ۸

فصل ۷

آدمؑ، فرشتے اور ابلیس

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ
اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ
خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ
فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ
یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ
بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ
اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَ
عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا
ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ
فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ
هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝
قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ
لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ
اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۝
قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ
بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ
اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ

پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب
نے فرشتوں سے کہا تھا کہ "میں زمین میں ایک خلیفہ
بنانے والا ہوں"۔ انھوں نے عرض کیا، "کیا آپ
زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس
کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا؟
آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے
تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں"۔ فرمایا، "میں جانتا
ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے"۔ اس کے بعد اللہ نے
آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے، پھر انہیں
فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا "اگر تمہارا
خیال صحیح ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام
بگڑ جائے گا) تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ"۔
انھوں نے عرض کیا "نقص سے پاک تو آپ
ہی کی ذات ہے، ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے
ہیں، جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے۔ حقیقت
میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا
کوئی نہیں"۔ پھر اللہ نے آدم سے کہا "تم انہیں

قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۙ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ۔

"ان چیزوں کے نام بتاؤ" جب اس نے ان کو سارے نام بتا دیئے تو اللہ نے فرمایا "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں، جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اسے بھی میں جانتا ہوں۔"

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ ۔ أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ۔

پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ "آدم کے آگے جھک جاؤ" تو سب جھک گئے مگر ابلیس نے انکار کیا وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ۔ فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۔

پھر ہم نے آدم سے کہا کہ "تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ، مگر اس درخت کا رخ نہ کرنا ورنہ ظالموں میں شمار ہو گے۔" آخر کار شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انہیں اس حالت سے نکلوا کر چھوڑا جس میں وہ تھے۔ ہم نے حکم دیا کہ "اب تم سب یہاں سے اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور وہیں گزر بسر کرنا ہے۔"

فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۔

اس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی، جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا، کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۔

ہم نے کہا کہ "تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔" پھر

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ
هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَ
كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝
(البقرہ۔ آیات ۳۰ تا ۳۹)

جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس
پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی
کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع
نہ ہوگا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے
اور ہماری آیات جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے
والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔"

شرفِ انسانی اور پستیِ ابلیس

یہ الفاظ (خَلَقْتُ بِيَدَيَّ - ص، آیت ۷۵) تخلیق انسانی کے شرف پر دلالت کرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ بادشاہ کا اپنے خدام سے کوئی کام کرانا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ ایک معمولی کام تھا جو خدام سے کرا لیا گیا۔ بخلاف اس کے بادشاہ کا کسی کام کو بنفس نفیس انجام دینا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ایک افضل و اشرف کام تھا۔ پس اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جسے میں نے خود بلا واسطہ بنایا ہے اس کے آگے جھکنے سے تجھے کس چیز نے روکا؟

دونوں ہاتھوں کے لفظ سے غالباً اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس نئی مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی شانِ تخلیق کے دو اہم پہلو پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اسے جسمِ حیوانی عطا کیا گیا، جس کی بنا پر وہ حیوانات کی جنس ہی سے ایک نوع ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے اندر وہ روح ڈال دی گئی جس کی بنا پر وہ اپنی صفات میں تمام ارضی مخلوقات سے اشرف و افضل ہو گیا۔

آدم کو سجدہ کرانے کا مفہوم

سورۂ بقرہ میں حکم سجدہ کا ذکر جن الفاظ میں آیا ہے ان سے شبہ ہو سکتا ہے کہ فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم صرف آدمؑ کی شخصیت کے لیے دیا گیا تھا، مگر یہاں وہ شبہ دور ہو جاتا ہے۔ یہاں جو اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آدم کو جو سجدہ کرایا گیا تھا وہ آدمؑ ہونے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ نوعِ انسانی کا نمائندہ فرد ہونے کی حیثیت سے تھا۔ اور یہ جو فرمایا کہ "ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمہیں صورت بخشی، پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو"، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے پہلے تمہاری تخلیق کا منصوبہ بنایا، اور تمہارا مادۂ آفرینش تیار کیا، پھر اس مادے کو انسانی صورت عطا کی۔ پھر جب ایک زندہ انسان کی حیثیت

سے آدمؑ وجود میں آگیا تو اسے سجدہ کرنے کے لیے فرشتوں کو حکم دیا۔ اس آیت کی یہ تشریح خود قرآن مجید میں دوسرے مقامات پہ بیان ہوئی۔ "تصور کرو اس وقت کا جب کہ تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح تیار کرلوں اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔"

خلافتِ آدم کے متعلق فرشتوں کا اشکال

قَالُوْا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ (البقرہ۔ آیت ۳۰)

انھوں نے عرض کیا: "کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔"

یہ فرشتوں کا اعتراض نہ تھا، بلکہ استفہام تھا۔ فرشتوں کی کیا مجال کہ خدا کی کسی تجویز پر اعتراض کریں۔ وہ "خلیفہ" کے لفظ سے یہ تو سمجھ گئے تھے کہ اس زیرِ تجویز مخلوق کو زمین میں کچھ اختیارات دیے جانے والے ہیں، مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ سلطنت کے اس نظام میں کسی بااختیار مخلوق کی گنجائش کیسے ہو سکتی ہے، اور اگر کسی کی طرف کچھ ذرا سے بھی اختیارات منتقل کر دیے جائیں، تو سلطنت کے جس حصے میں بھی ایسا کیا جائے گا وہاں کا انتظام خرابی سے کیسے بچ جائے گا۔ اس بات کو وہ سمجھنا چاہتے تھے۔

اس فقرے سے فرشتوں کا مدعا یہ نہ تھا کہ خلافت ہمیں دی جائے، ہم اس کے مستحق ہیں، بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ حضور کے فرامین کی تعمیل ہو رہی ہے، آپ کے احکام بجالانے میں ہم پوری طرح سرگرم ہیں۔ مرضیِ مبارک کے مطابق سارا جہان پاک صاف رکھا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ آپ کی حمد و ثنا اور آپ کی تسبیح و تقدیس بھی ہم خدام ادا کر رہے ہیں۔ اب کمی کس چیز کی ہے کہ اس کے لیے ایک خلیفہ کی ضرورت ہو؟ ہم اس کی مصلحت نہیں سمجھ سکتے (تسبیح کا لفظ ذو معنین ہے، اس کے معنی پاکی بیان کرنے کے بھی ہیں اور سرگرمی کے ساتھ کام اور انہماک کے ساتھ سعی کرنے کے بھی۔ اسی طرح تقدیس کے بھی دو معنی ہیں۔ ایک تقدس کا اظہار زبان، دوسرے پاک کرنا)

قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ۔ آیت ۳۰)

فرمایا: میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے

یہ فرشتوں کے دوسرے شبہہ کا جواب ہے۔ یعنی فرمایا: خلیفہ مقرر کرنے کی ضرورت و مصلحت میں جانتا ہوں، تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اپنی جن خدمات کا ذکر تم کر رہے ہو، وہ کافی نہیں ہیں۔ بلکہ ان سے بڑھ کر کچھ مطلوب ہے۔ اسی لیے زمین میں ایک ایسی مخلوق پیدا کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے جس کی طرف کچھ اختیارات منتقل کیے جائیں۔

انسان کے علم کی صورت دراصل یہی ہے کہ وہ ناموں کے ذریعے سے اشیاء کو اپنے ذہن کی گرفت میں لاتا ہے، لہٰذا انسان کی تمام معلومات دراصل اسمائے اشیاء پر مشتمل ہیں۔ آدم کو سارے نام سکھانا گویا ان کو تمام اشیاء کا علم دینا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرشتے اور فرشتوں کی ہر صنف کا علم صرف اسی شعبے تک محدود ہے جس سے اس کا تعلق ہے۔ مثلاً ہوا کے انتظام سے جو فرشتے متعلق ہیں وہ ہوا کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں۔ مگر پانی کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ یہی حال دوسرے شعبوں کے فرشتوں کا ہے۔ انسان کو ان کے برعکس جامع علم دیا گیا ہے۔ ایک ایک شعبے کے متعلق چاہے وہ اس شعبے کے فرشتوں سے کم جانتا ہو، مگر مجموعی حیثیت سے جو جامعیت انسان کے علم کو بخشی گئی ہے، وہ فرشتوں کو میسر نہیں ہے۔

یہ مظاہرہ فرشتوں کے پہلے شبہ کا جواب تھا۔ گویا اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے انھیں بتا دیا کہ میں آدم کو صرف اختیارات ہی نہیں دے رہا ہوں، بلکہ علم بھی دے رہا ہوں۔ اس کے تقرر سے فساد کا جو اندیشہ تمہیں ہوا وہ اس معاملہ میں صرف ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو اصلاح کا بھی ہے اور وہ فساد کے پہلو سے زیادہ وزنی اور زیادہ بیش قیمت ہے۔ حکیم کا کام یہ نہیں ہے کہ چھوٹی خرابی کی وجہ سے بڑی بہتری کو نظر انداز کر دے۔

حقیقتِ فرشتہ

ملک کے اصل معنی "پیامبر" کے ہیں۔ اسی کا لفظی ترجمہ فرستادہ یا فرشتہ ہے۔ یہ محض مجرد قوتیں نہیں ہیں جو تشخص نہ رکھتی ہوں بلکہ یہ شخصیت رکھنے والی ہستیاں ہیں۔ جن سے اللہ اپنی اس عظیم الشان سلطنت کی تدبیر و انتظام میں کام لیتا ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ سلطنتِ الٰہی کے اہل کار ہیں۔ جو اللہ کے احکام کو نافذ کرتے ہیں۔ جاہل لوگ انھیں غلطی سے خدائی میں حصہ دار سمجھ بیٹھے اور بعض نے انھیں خدا کا رشتہ دار سمجھا اور ان کو دیوتا بنا کر ان کی پرستش شروع کر دی۔

فصل ۸

قیامِ جنّت اور اخراج

آدمؑ کو جنّت میں رکھنے کا مقصد

جنّت ممکن ہے آسمانوں میں ہو، اور ممکن ہے کہ اسی زمین پر بنائی گئی ہو۔ بہرحال وہاں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اس شان سے رکھا گیا تھا کہ اس کے کھانے پینے اور لباس و مکان کا سارا انتظام سرکار کے ذمہ تھا۔ اور خدمت گار (فرشتے) اس کے حکم کے تابع تھے۔ اس کو اپنی ذاتی ضروریات کے لیے قطعاً کوئی فکر نہ کرنی پڑتی تھی، تاکہ وہ خلافت کے بزرگ تر وظائف ادا کرنے کے لیے مستعد ہو سکے۔ مگر اس عہدے پر مستقل تقرر ہونے سے پہلے امتحان لینا ضروری سمجھا گیا، تاکہ امیدوار کی صلاحیتوں کا حال کھل جائے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کی کمزوریاں کیا ہیں۔ چنانچہ امتحان لیا گیا اور جو بات کھلی وہ یہ تھی کہ یہ امیدوار تحریص و اطماع کے اثر میں آکر پھسل جاتا ہے، اطاعت کے عزم پر مضبوطی سے قائم نہیں رہتا اور اس کے علم پر نسیان غالب آجاتا ہے۔

جنّت کا تصور

جنّت کی اس زندگی کو جو لوگ محض کھانے پینے اور اینڈنے کی زندگی سمجھتے ہیں، ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ وہاں پیہم ترقی ہو گی بغیر اس کے کہ اس کے لیے تنزل کا خطرہ ہو۔ اور وہاں خلافتِ الٰہی کے عظیم الشان کام انسان انجام دے گا بغیر اس کے کہ اسے پھر کسی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔ مگر ان ترقیات اور خدمات کا تصور کرنا ہمارے لیے اتنا ہی مشکل ہے جتنا ایک بچے کے لیے یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ بڑا ہو کر جب وہ شادی کرے گا تو ازدواجی زندگی کی کیفیات کیا ہوں گی۔ اسی لیے قرآن مجید میں جنّت کی زندگی کے صرف انہی لذائذ کا ذکر کیا گیا ہے جن کا ہم اس دنیا کی لذّتوں پر قیاس کر کے کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔

امتناعی حکم کے ذریعے آزمائش

زمین، یعنی اپنی جائے تقرر پر خلیفہ کی حیثیت سے بھیجے جانے سے پہلے آدم و حوا کو امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا تاکہ ان کے رجحانات کی آزمائش ہو جائے۔ اس آزمائش کے لیے ایک درخت کو چن لیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اس درخت کے قریب نہ پھٹکنا، اور اس کا انجام بھی بتادیا گیا کہ ایسا کرو گے تو ہماری نگاہ میں ظالم قرار پاؤ گے۔ یہ بحث غیر ضروری ہے کہ وہ درخت کونسا تھا اور اس میں کیا خاص بات تھی کہ اس سے منع کیا گیا۔ منع کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس درخت کی خاصیت میں کوئی خرابی تھی اور اس سے آدم و حوا کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ اصل غرض اس بات کی آزمائش تھی کہ یہ شیطان کی ترغیبات کے مقابلے میں کس حد تک حکم کی پیروی پر قائم رہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے کسی ایک چیز کا منتخب کر لینا کافی تھا۔ اسی لیے اللہ نے درخت کا نام اور اس کی خاصیت کا کوئی ذکر نہیں فرمایا۔

جنت میں اوّلین امتحان کے ذریعے تفہیم

اس امتحان کے لیے جنت ہی کا مقام سب سے زیادہ موزوں تھا۔ دراصل اسے امتحان گاہ بنانے کا مقصود یہ حقیقت انسان کے ذہن نشین کرنا تھا کہ تمہارے لیے مرتبۂ انسانیت کے لحاظ سے جنت ہی لائق و مناسب مقام ہے۔ لیکن شیطانی ترغیبات کے مقابلے میں اگر تم اللہ کی فرمانبرداری کے راستہ سے منحرف ہو جاؤ گے، تو جس طرح ابتدا میں اس سے محروم کیے گئے تھے اسی طرح آخر میں محروم ہی رہو گے۔ اپنے اس مقامِ لائق کی، اپنی اس فردوس گم گشتہ کی بازیافت تم صرف اس طرح کر سکتے ہو کہ اپنے اس دشمن کا کامیابی سے مقابلہ کرو، جو تمہیں فرمانبرداری کے راستہ سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔

لغزشِ آدمؑ کی حقیقت

آدمؑ نے بعد میں اس حکم کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ اختیاری قصدی اور ارادی سرکشی کی بنا پر نہ تھا، بلکہ غفلت اور بھول میں پڑ جانے اور عزم و ارادے کی کمزوری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے تھا۔ اس نے حکم کی خلاف ورزی کچھ اس خیال و نیت کے ساتھ نہیں کی تھی کہ میں خدا کی کیا پرواہ کرتا ہوں، اس کا حکم ہے تو ہوا کرے، جو کچھ میرا جی چاہے گا کروں گا۔ خدا کون ہوتا ہے جو میرے معاملات میں دخل دے؟ اس کے بجائے اس کی نافرمانی کا سبب یہ تھا کہ اس نے ہمارا حکم یاد رکھنے کی کوشش نہ کی، بھول گیا کہ ہم نے اسے کیا سمجھایا تھا اور اس کے ارادے میں اتنی مضبوطی نہ تھی کہ جب شیطان اسے بہکانے آیا اس وقت ہماری پیشگی تنبیہ اور نصیحت و فہمائش

کو (جس کا ذکر ابھی آگے آتا ہے) یاد کرتا اور اس کے دیے ہوئے لالچ کا سختی کے ساتھ مقابلہ کرتا۔ بعض لوگوں نے "اس میں عزم نہ پایا" کا مطلب یہ لیا ہے کہ "ہم نے اس میں نافرمانی کا عزم نہ پایا"۔ یعنی اس نے جو کچھ کیا بھولے سے کیا۔ لیکن یہ خواہ مخواہ کا تکلف ہے۔ یہ بات اگر کہنی ہوتی تو لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا عَلَى الْعِصْيَانِ کہا جاتا۔ نہ کہ محض لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ فقدانِ عزم سے مراد اطاعتِ حکم کے عزم کا فقدان ہے، نہ کہ نافرمانی کے عزم کا فقدان۔ علاوہ بریں اگر موقع و محل اور سیاق و سباق کی مناسبت سے دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اللہ آدمؑ کی پوزیشن صاف کرنے کے لیے یہ قصہ بیان نہیں کر رہا ہے، بلکہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ وہ بشری کمزوری کیا تھی جس کا صدور ان سے ہوا، اور جس کی بدولت صرف وہی نہیں بلکہ ان کی اولاد بھی اللہ تعالیٰ کی پیشگی تنبیہات کے باوجود اپنے دشمن کے پھندے میں پھنسی اور پھنستی رہی ہے۔ مزید براں، جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر اس آیت کو پڑھے گا اس کے ذہن میں پہلا مفہوم یہی آئے گا کہ "ہم نے اس میں اطاعتِ امر کا عزم یا مضبوط ارادہ نہ پایا"۔ دوسرا مفہوم اس کے ذہن میں اس وقت تک نہیں آسکتا جب تک وہ آدمؑ کی طرف معصیت کی نسبت کو نامناسب سمجھ کر آیت کے کسی اور معنی کی تلاش شروع نہ کر دے۔ یہی رائے علامہ آلوسیؒ نے بھی اس موقع پر اپنی تفسیر میں ظاہر فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"مگر تم سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ یہ تفسیر آیت کے الفاظ سن کر فوراً ذہن میں نہیں آتی اور نہ موقع محل کے ساتھ کچھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔"

یہاں اس بشری کمزوری کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے جو آدمؑ سے ظہور میں آئی۔ اللہ کو وہ اپنا خالق اور رب جانتے تھے اور دل سے مانتے تھے۔ جنت میں ان کو جو آسائشیں حاصل تھیں، ان کا تجربہ انھیں خود ہر وقت ہو رہا تھا۔ شیطان کے حسد و عداوت کا بھی ان کو براہِ راست علم ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دینے کے ساتھ ہی بتا دیا تھا کہ یہ تمھارا دشمن تمھیں نافرمانی پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا، اور اس کا تمھیں یہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔ شیطان ان کے سامنے چیلنج دے چکا تھا کہ میں اسے بہکاؤں گا اور اس کی بیخ کنی کر کے چھوڑوں گا۔ ان ساری باتوں کے باوجود جب شیطان نے ان کو ناصحِ مشفق اور خیرخواہ دوست کے بھیس میں آکر ایک بہتر حالت (زندگیٔ جاوداں اور سلطنت لازوال) کا لالچ دیا تو وہ اس کی تحریص کے مقابلے میں جم نہ سکے اور پھسل گئے۔ حالانکہ اب بھی خدا پر ان کے عقیدے میں فرق نہ آیا تھا، اور اس کے فرمان کے بارے میں ایسا کوئی خیال ان کے ذہن میں نہیں تھا کہ وہ سرے سے واجب الاذعان ہی نہیں ہے۔ بس ایک فوری

جذبے نے، جو شیطانی تحریص کے زیرِ اثر اُبھر آیا تھا، اُن پر ذہول طاری کر دیا، اور ضبطِ نفس کی گرفت ڈھیلی
ہوتے ہی وہ طاعت کے مقامِ بلند سے معصیت کی پستی میں جا گرے۔ یہی وہ بھول اور فقدانِ عزم ہے جس کا
ذکر قصے کے آغاز میں کیا گیا تھا اور اسی چیز کا نتیجہ وہ نافرمانی اور بھٹک ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔
یہ انسان کی وہ کمزوری ہے جو ابتدائے آفرینش ہی میں اس سے ظاہر ہوئی اور بعد میں کوئی زمانہ ایسا نہیں
گزرا ہے جبکہ یہ کمزوری اس میں نہ پائی گئی ہو۔

انسانی عظمت کا راز

شیطان یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ انسان اس فضیلت کا مستحق نہیں ہے جو اس کے مقابلہ میں انسان ۹
کو دی گئی ہے۔ پہلے ہی معرکے میں اس نے شکست کھائی۔ اس میں شک نہیں کہ اس معرکے میں انسان
اپنے رب کے امر کی فرمانبرداری کرنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا اور اس کی یہ کمزوری ظاہر ہو گئی کہ
وہ اپنے حریف کے فریب میں آ کر اطاعت کی راہ سے ہٹ سکتا ہے۔ مگر بہرحال اس اوّلین مقابلہ میں یہ قطعی
ثابت ہو گیا کہ انسان اپنے اخلاقی مرتبہ میں ایک افضل مخلوق ہے۔ اولاً شیطان اپنی بڑائی کا خود مدعی تھا
اور انسان نے اس کا دعویٰ آپ نہیں کیا، بلکہ بڑائی اسے دی گئی۔ ثانیاً شیطان نے خالص غرور و تکبر کی بنا
پر اللہ کے امر کی نافرمانی آپ اپنے اختیار سے کی، اور انسان نے نافرمانی کو خود اختیار نہیں کیا، بلکہ شیطان
کے بہکانے سے وہ اس میں مبتلا ہوا۔ اس نے شر کی کھلی دعوت کو قبول نہیں کیا، بلکہ داعیٔ شر کو داعیٔ خیر
بن کر اس کے سامنے آنا پڑا۔ وہ پستی کی طرف پستی کی طلب میں نہیں گیا بلکہ اس دھوکے میں مبتلا ہو کر گیا کہ
یہ راستہ اسے بلندی کی طرف لے جائے گا۔ ثالثاً شیطان کو تنبیہ کی گئی تو وہ اپنے قصور کا اعتراف کرنے
اور بندگی کی طرف ہٹ آنے کی بجائے نافرمانی پر اور زیادہ جم گیا، اور جب انسان کو اس کے قصور پر تنبیہ
کیا گیا تو اس نے شیطان کی طرح سرکشی نہیں کی، بلکہ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ نادم ہوا اور اپنے
قصور کا اعتراف کر کے بغاوت سے اطاعت کی طرف پلٹ آیا اور معافی مانگ کر اپنے رب کے دامنِ رحمت
میں پناہ ڈھونڈنے لگا۔

خیرخواہی کے راستے سے شیطان کا حملہ

یہ بھی انسان کی عین فطرت ہے کہ وہ برائی کی کھلی دعوت کو کم ہی قبول کرتا ہے۔ عموماً اسے جال میں
پھانسنے کے لیے ہر داعیٔ شر کو خیرخواہ کے بھیس میں آنا پڑتا ہے۔

انسان کے اندر معالی امور مثلاً بشریت سے بالاتر مقام پر پہنچنے یا حیاتِ جاودان حاصل کرنے کی ایک فطری پیاس موجود ہے اور شیطان کو اسے فریب دینے میں پہلی کامیابی اسی ذریعے سے ہوئی کہ اس نے انسان کی اس خواہش سے اپیل کیا۔ شیطان کا سب سے زیادہ چلتا ہوا حربہ یہ ہے کہ وہ آدمی کو بلندی پر لے جانے اور موجودہ حالت سے بہتر حالت پر پہنچا دینے کی امید دلاتا ہے، اور پھر اس کے لیے وہ راستہ پیش کرتا ہے جو الٹا اسے پستی کی طرف لے جائے۔

حضرت حوا کے متعلق غلط روایت

عام طور پر یہ جو مشہور ہو گیا ہے کہ شیطان نے پہلے حضرت حوا کو دامِ فریب میں گرفتار کیا اور پھر انھیں حضرت آدمؑ کو پھانسنے کے لیے آلۂ کار بنایا، قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ شیطان نے دونوں کو دھوکا دیا اور وہ دونوں اس سے دھوکا کھا گئے۔ بظاہر یہ چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن جن لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت حوا کے متعلق اس مشہور روایت نے دنیا میں عورت کے اخلاقی، قانونی اور معاشرتی مرتبے کو گرانے میں کتنا زبردست حصہ لیا ہے وہی قرآن کے اس بیان کی حقیقی قدر و قیمت سمجھ سکتے ہیں۔

جذبۂ شرم و حیا پر ضرب

اس قصے سے چند اہم حقیقتوں پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ انسان کے اندر شرم و حیا کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اور اس کا اوّلین مظہر وہ شرم ہے جو اپنے جسم کے مخصوص حصوں کو دوسروں کے سامنے کھولنے میں آدمی کو فطرۃً محسوس ہوتی ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ شرم انسان کے اندر تہذیب کے ارتقا سے مصنوعی طور پر پیدا نہیں ہوئی ہے اور نہ یہ اکتسابی چیز ہے، جیسا کہ شیطان کے بعض شاگردوں نے قیاس کیا ہے، بلکہ درحقیقت یہ وہ فطری چیز ہے جو اوّل روز سے انسان میں موجود تھی۔

(۲) شیطان کی پہلی چال جو اس نے انسان کو فطرتِ انسانی کی سیدھی راہ سے ہٹانے کے لیے چلی، یہ تھی کہ اس کے اس جذبۂ شرم و حیا پر ضرب لگائے، اور برہنگی کے راستے سے اس کے لیے فواحش کا دروازہ کھولے اور اس کو صنفی معاملات میں بدراہ کر دے۔ بالفاظِ دیگر اپنے حریف کے محاذ میں ضعیف ترین مقام جو اس نے تاکنے کے لیے تلاش کیا، وہ اس کی زندگی کا صنفی پہلو تھا۔ اور پہلی ضرب جو ... سکا وہ اس محاذ کی فصیل پر

ننگا پن جو شرم و حیا کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں رکھی تھی۔ شیاطین اور ان کے شاگردوں کی یہ روش آج تک جوں کی توں قائم ہے۔ "ترقی" کا کوئی کام ان کے ہاں شروع نہیں ہو سکتا جب تک عورت کو بے پردہ بازار میں نہ لا کھڑا کریں۔

قصۂ آدمؑ مسئلہ لباس اور عریوں کے لیے ہدایت

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ	"اے اولادِ آدم! ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے
لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَ رِیۡشًا	جسم کے قابلِ شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہارے لیے جسم
وَ لِبَاسُ التَّقۡوٰی ۙ ذٰلِکَ خَیۡرٌ ؕ	کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو، اور بہترین لباس
ذٰلِکَ مِنۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ لَعَلَّہُمۡ	تقویٰ کا لباس ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک
یَذَّکَّرُوۡنَ ○	نشانی ہے، شاید کہ لوگ اس سے سبق لیں۔
یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ لَا یَفۡتِنَنَّکُمُ الشَّیۡطٰنُ	اے بنی آدم! ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں پھر اسی طرح
کَمَاۤ اَخۡرَجَ اَبَوَیۡکُمۡ مِّنَ الۡجَنَّۃِ	فتنے میں مبتلا کر دے جس طرح اس نے تمہارے
یَنۡزِعُ عَنۡہُمَا لِبَاسَہُمَا لِیُرِیَہُمَا	والدین کو جنت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس
سَوۡاٰتِہِمَا ؕ اِنَّہٗ یَرٰىکُمۡ	ان پر سے اتروا دیے تھے تاکہ ان کی شرمگاہیں ایک
ہُوَ وَ قَبِیۡلُہٗ مِنۡ حَیۡثُ لَا	دوسرے کے سامنے کھولے۔ وہ اور اس کے ساتھی
تَرَوۡنَہُمۡ ؕ اِنَّا جَعَلۡنَا الشَّیٰطِیۡنَ	تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انھیں نہیں
اَوۡلِیَآءَ لِلَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ○	دیکھ سکتے۔ ان شیاطین کو ہم نے اُن لوگوں کا سرپرست
(الاعراف، آیت ۲۶-۲۷)	بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔"

یہاں قصۂ آدم و حوا کے ایک خاص پہلو کی طرف توجہ منعطف کر کے اہل عرب کے سامنے خود ان کی اپنی زندگی کے اندر شیطانی اغوا کے ایک نمایاں ترین اثر کی نشان دہی فرمائی جاتی ہے۔ یہ لوگ لباس کو صرف زینت اور موسمی اثرات سے جسم کی حفاظت کے لیے استعمال کرتے تھے، لیکن اس کی سب سے بنیادی غرض یعنی جسم کے قابلِ شرم حصوں کی پردہ پوشی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ انھیں اپنے ستر دوسروں کے سامنے کھول دینے میں کوئی باک نہ تھا۔ برہنہ منظرِ عام پر نہا لینا، راہ چلتے قضائے حاجت کے لیے بیٹھ جانا، ازار کھل جائے تو ستر کے بے پردہ ہو جانے کی پروا نہ کرنا ان کے شب و روز کے معمولات تھے۔ اس سے

بھی بڑھ کر یہ کہ ان میں سے بکثرت لوگ حج کے موقعہ پر کعبہ کے گرد برہنہ طواف کرتے تھے اور اس معاملہ میں ان کی عورتیں ان کے مردوں سے بھی کچھ زیادہ بے حیا تھیں۔ ان کی نگاہ میں یہ ایک مذہبی فعل تھا اور نیک کام سمجھ کر وہ اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ پھر چونکہ یہ کوئی عربوں ہی کی خصوصیت نہ تھی، دنیا کی اکثر قومیں اسی بے حیائی میں مبتلا رہی ہیں اور آج تک ہیں اس لیے خطاب اہل عرب کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ عام ہے اور سارے بنی آدم کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ دیکھو، یہ شیطانی اغوا کی ایک کھلی ہوئی علامت تمھاری زندگی میں موجود ہے۔ تم نے اپنے رب کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر اور اس کے رسولوں کی دعوت سے منہ موڑ کر اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کر دیا اور اس نے تمھیں انسانی فطرت کے راستے سے ہٹا کر اسی بے حیائی میں مبتلا کر دیا جس میں وہ تمھارے پہلے باپ اور ماں کو مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ اس پر غور کرو تو یہ حقیقت تم پر کھل جائے کہ رسولوں کی رہنمائی کے بغیر تم اپنی فطرت کے ابتدائی مطالبات تک کو نہ سمجھ سکتے ہو اور نہ پورا کر سکتے ہو۔

ان آیات میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے اس سے چند اہم حقیقتیں نکھر کر سامنے آجاتی ہیں۔

اول یہ کہ لباس انسان کے لیے ایک مصنوعی چیز نہیں ہے بلکہ انسانی فطرت کا ایک اہم مطالبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم پر حیوانات کی طرح کوئی پوشش پیدائشی طور پر نہیں رکھی بلکہ حیا اور شرم کا مادہ اس کی فطرت میں ودیعت کر دیا۔ اس نے انسان کے لیے اس کے اعضائے صنفی کو محض اعضائے صنفی ہی نہیں بنایا بلکہ سَوْاٰۃ بھی بنایا جس کے معنی عربی زبان میں ایسی چیز کے ہیں جس کے اظہار کو آدمی قبیح سمجھے۔ پھر اس فطری شرم کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے اس نے کوئی بنا بنایا لباس انسان کو نہیں دے دیا بلکہ اس کی فطرت پر لباس کا الہام کیا (اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا) تاکہ وہ اپنی عقل سے کام لے کر اپنی فطرت کے اس مطالبے کو سمجھے اور پھر اللہ کے پیدا کردہ مواد سے کام لے کر اپنے لیے لباس فراہم کرے۔

دوم یہ کہ اس فطری الہام کی رو سے انسان کے لیے لباس کی اخلاقی ضرورت مقدم ہے، یعنی یہ کہ وہ اپنی سَوْاٰۃ کو ڈھانکے، اور اس کی طبعی ضرورت مؤخر ہے، یعنی یہ کہ اس کا لباس اس کے لیے ریش (جسم کی آرائش اور موسمی اثرات سے بدن کی حفاظت کا ذریعہ) ہو۔ اس باب میں بھی فطرۃً انسان کا معاملہ حیوانات کے برعکس ہے۔ ان کے لیے پوشش کی اصل غرض صرف اس کا "ریش" ہونا ہے، رہا اس کا ستر پوش ہونا تو ان کے اعضائے صنفی سرے سے سَوْاٰۃ ہی نہیں ہیں کہ انھیں چھپانے کے لیے حیوانات کی جبلت میں کوئی داعیہ موجود ہوتا۔

اور اس کا تقاضا پورا کرنے کے لیے ان کے اجسام پر کوئی لباس پیدا کیا جاتا۔ لیکن جب انسانوں نے شیطان کی رہنمائی قبول کی تو معاملہ پھر اُلٹ گیا۔ اس نے اپنے ان شاگردوں کو غلط فہمی میں ڈال دیا کہ تمہارے لیے لباس کی ضرورت بعینہٖ وہی ہے جو حیوانات کے لیے ریش کی ضرورت ہے، رہا اس کا سَوْاٰتْ کو چھپانے والی چیز ہونا تو یہ قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتا، بلکہ جس طرح حیوانات کے اعضاء سَوْاٰتْ نہیں ہیں اسی طرح تمہارے یہ اعضاء بھی سَوْاٰتْ نہیں، محض اعضائے صنفی ہی ہیں۔

سوم یہ کہ انسان کے لیے لباس کا صرف ذریعۂ ستر پوشی اور وسیلۂ زینت وحفاظت ہونا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ فی الحقیقت اس معاملہ میں جس بھلائی تک انسان کو پہنچنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اُس کا لباس تقویٰ کا لباس ہو، یعنی پوری طرح ساتر بھی ہو، زینت میں بھی حد سے بڑھا ہوا یا آدمی کی حیثیت سے گرا ہوا نہ ہو، فخر وغرور اور تکبر وریا کی شان لیے ہوئے بھی نہ ہو، اور پھر اُن ذہنی امراض کی نمائندگی بھی نہ کرتا ہو جن کی بنا پر مرد زنانہ پن اختیار کرتے ہیں، عورتیں مردانہ پن کی نمائش کرنے لگتی ہیں، اور ایک قوم دوسری قوم کے مشابہ بننے کی کوشش کر کے خود اپنی ذلت کا زندہ اشتہار بن جاتی ہے۔ لباس کے معاملہ میں اس خیرِ مطلوب کو پہنچنا تو کسی طرح اُن لوگوں کے بس میں ہے ہی نہیں جنھوں نے انبیاء علیہم السلام پر ایمان لاکر اپنے آپ کو بالکل خدا کی رہنمائی کے حوالے نہیں کر دیا ہے۔ جب وہ خدا کی رہنمائی تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں تو شیاطین ان کے سرپرست بنا دیے جاتے ہیں، پھر یہ شیاطین ان کو کسی نہ کسی غلطی میں مبتلا کر کے ہی چھوڑتے ہیں۔

چہارم یہ کہ لباس کا معاملہ بھی اللہ کی ان بے شمار نشانیوں میں سے ایک ہے جو دنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں اور حقیقت تک پہنچنے میں انسان کی مدد کرتی ہیں۔ بشرطیکہ انسان خود ان سے سبق لینا چاہے۔ اوپر جن حقائق کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اگر انھیں تامل کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ لباس کس حیثیت سے اللہ تعالیٰ کا ایک اہم نشان ہے۔

ستر کھل جانا نافرمانی کا نتیجہ تھا

یہ گمان کرنے کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ شجرِ ممنوعہ کا مزا چکھتے ہی آدم وحوا کے ستر کا کھل جانا اس درخت کی کسی خاصیت کا نتیجہ تھا۔ درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے سوا کسی اور چیز کا نتیجہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کا ستر اپنے انتظام سے ڈھانپا تھا۔ جب انھوں نے خلاف ورزی کی تو خدا کی حفاظت ان سے ہٹالی گئی، ان کا پردہ کھول دیا گیا اور انھیں خود ان کے نفس کے حوالے کر دیا گیا کہ اپنی پردہ پوشی کا انتظام

خود کریں، اگر اس کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ اور اگر ضرورت نہ سمجھیں یا اس کے لیے سعی نہ کریں۔ تو خدا کو اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ وہ کس حال میں پھرتے ہیں۔ یہ گویا ہمیشہ کے لیے اس حقیقت کا مظاہرہ تھا کہ انسان جب خدا کی نافرمانی کرے گا تو دیر یا سویر اس کا پردہ کھل کر رہے گا، اور یہ کہ انسان کے ساتھ خدا کی تائید و حمایت صرف اسی وقت تک رہے گی جب تک وہ خدا کا مطیعِ فرمان رہے گا۔ طاعت کے حدود سے قدم باہر نکالنے کے بعد اسے خدائی تائید ہرگز حاصل نہ رہے گی، بلکہ اسے خود اس کے نفس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یہی وہ مضمون ہے جو متعدد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اور اسی کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہے۔ "خدایا! میں تیری رحمت کا امیدوار ہوں۔ پس مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی میرے نفس کے حوالے نہ کر"۔

اس طرح شیطان کی راہ اور وہ راہ جو انسان کے لائق ہے، دونوں ایک دوسرے سے ممیز ہو گئیں۔ خالص شیطانی راہ یہ ہے کہ بندگی سے منہ موڑے اور خدا کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرے۔ متنبہ کیے جانے کے باوجود پورے استکبار کے ساتھ اپنے باغیانہ طرزِ عمل پر اصرار کیے چلا جائے۔ اور جو لوگ اطاعت کی راہ چل رہے ہوں۔ ان کو بھی بہکائے اور معصیت کی راہ پر لانے کی کوشش کرے۔ بخلاف اس کے جو راہ انسان کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ اول تو وہ شیطانی اغوا کی مزاحمت کرے، اور اپنے اس دشمن کی چالوں کو سمجھنے اور ان سے بچنے کے لیے ہر وقت چوکنا رہے، لیکن اگر کبھی اس کا قدم بندگی و اطاعت کی راہ سے ہٹ بھی جائے تو اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی ندامت و شرمساری کے ساتھ فوراً اپنے رب کی طرف پلٹے اور اس قصور کی تلافی کر دے جو اس سے سرزد ہو گیا ہے۔ یہی وہ اصل سبق ہے جو اللہ تعالیٰ اس قصے سے یہاں دینا چاہتا ہے۔

خطا معاف کرانے کی خواہش

آدم کو جب اپنے قصور کا احساس ہوا اور انھوں نے نافرمانی سے پھر فرماںبرداری کی طرف رجوع کرنا چاہا، اور ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے رب سے اپنی خطا معاف کرائیں تو انھیں وہ الفاظ نہ ملتے تھے جن کے ساتھ وہ خطا بخشی کے لیے دعا کر سکتے۔ اللہ نے ان کے حال پر رحم فرما کر وہ الفاظ بتا دیے۔[1]

توبۂ آدم اور حقیقتِ ظلم

ظالم کا لفظ نہایت معنی خیز ہے۔ "ظلم" دراصل حق تلفی کو کہتے ہیں۔ ظالم وہ ہے جو کسی کا حق تلف

---

[1] رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (الاعراف۔ ۲۳) (از مرتبین)

کرے۔ جو شخص خدا کی نافرمانی کرتا ہے، وہ درحقیقت تین بڑے بنیادی حقوق تلف کرتا ہے۔ اولاً خدا کا حق، کیونکہ وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی فرمانبرداری کی جائے۔ ثانیاً ان تمام چیزوں کے حقوق، جن کو اس نے نافرمانی کے ارتکاب میں استعمال کیا۔ اس کے اعضائے جسمانی، اس کے قوائے نفس، اس کے ہم معاشرت انسان، وہ فرشتے جو اس کے ارادے کی تکمیل کا انتظام کرتے ہیں، اور وہ اشیاء جو اس کام میں استعمال ہوتی ہیں، ان سب کا اس پر یہ حق تھا کہ وہ صرف ان کے مالک ہی کی مرضی کے مطابق ان پر اپنے اختیارات استعمال کرے۔ مگر جب اس کی مرضی کے خلاف اس نے ان پر اختیارات استعمال کیے تو درحقیقت ان پر ظلم کیا۔ ثالثاً خود اپنا حق، کیونکہ اس پر اس کی ذات کا یہ حق ہے کہ وہ اُسے تباہی سے بچائے۔ مگر نافرمانی کر کے جب وہ اپنے آپ کو اللہ کی سزا کا مستحق بناتا ہے تو دراصل اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے۔ انہی وجوہ سے قرآن میں جگہ جگہ گناہ کے لیے ظلم اور گناہگار کے لیے ظالم کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

گمراہ کن نظریۂ گناہ کی تردید

قرآن اس نظریے کی تردید کرتا ہے کہ گناہ کے نتائج لازمی ہیں اور وہ بہرحال انسان کو بھگتنے ہی ہوں گے۔ یہ انسان کے اپنے خودساختہ گمراہ کن نظریات میں سے ایک بڑا نظریہ ہے، کیونکہ جو شخص ایک مرتبہ گناہگار زندگی میں مبتلا ہو گیا۔ اس کو یہ نظریہ ہمیشہ کے لیے مایوس کر دیتا ہے اور اگر اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کے بعد وہ سابق کی تلافی اور آئندہ کے لیے اصلاح کرنا چاہے تو یہ اس سے کہتا ہے کہ تیرے بچنے کی اب کوئی امید نہیں۔ جو کچھ تو کر چکا ہے، اس کے نتائج بہرحال تیری جان کے لاگو ہی رہیں گے۔ قرآن اس کے برعکس یہ کہتا ہے کہ بھلائی کی جزا اور برائی کی سزا دینا بالکل اللہ کے اختیار میں ہے۔ تمہیں جس بھلائی پر انعام ملتا ہے وہ تمہاری بھلائی کا طبیعی نتیجہ نہیں ہے بلکہ اللہ کا فضل ہے، چاہے عنایت فرمائے، چاہے نہ فرمائے۔ اسی طرح جس برائی پر تمہیں سزا ملتی ہے، وہ بھی برائی کا طبیعی نتیجہ نہیں ہے کہ لازماً مترتب ہو کر ہی رہے، بلکہ اللہ تعالیٰ پورا اختیار رکھتا ہے کہ چاہے معاف کر دے اور چاہے سزا دے دے۔ البتہ اللہ کا فضل اور اس کی رحمت، اس کی حکمت کے ساتھ ہم رشتہ ہے۔ وہ چونکہ حکیم ہے اس لیے اپنے اختیارات کو اندھا دھند استعمال نہیں کرتا۔ جب کسی بھلائی پر انعام دیتا ہے تو یہ دیکھ کر ایسا کرتا ہے کہ بندے نے سچی نیت کے ساتھ اس کی رضا کے لیے بھلائی کی تھی، اور جس بھلائی کو رد کر دیتا ہے، اسے اس بنا پر رد کرتا ہے کہ اس کی ظاہری شکل بھلے کام کی سی تھی مگر اپنے اندر اپنے رب کی رضا جوئی کا خالص جذبہ نہ تھا۔ اسی طرح وہ سزا اس قصور پر دیتا ہے جو باغیانہ

جسارت کے ساتھ کیا جائے اور جس کے پیچھے شرمساری کے بجائے مزید ارتکاب جرم کی خواہش موجود ہو، اور اپنی رحمت سے معافی اس قصور پر دیتا ہے، جس کے بعد بندہ اپنے کیے پر شرمندہ اور آئندہ کے لیے اپنی اصلاح پر آمادہ ہو۔ بڑے سے بڑے مجرم، کٹے سے کٹے کافر کے لیے بھی خدا کے ہاں مایوسی و ناامیدی کا کوئی موقع نہیں، بشرطیکہ وہ اپنی غلطی کا معترف، اپنی نافرمانی پر نادم اور بغاوت کی روش چھوڑ کر اطاعت کی روش اختیار کرنے کے لیے تیار ہو۔

حضرت آدمؑ گناہ سے پاک کر دیے گئے

—— اطاعت کی کوشش میں ناکام ہو کر جہاں گر گئے تھے وہاں انھیں پڑا نہیں چھوڑ دیا گیا، بلکہ اٹھا کر پھر اپنے پاس بلا لیا۔ اور اپنی خدمت کے لیے چن لیا۔ ایک سلوک وہ ہے جو بالارادہ بغاوت کرنے والے اور اکڑ اور ہیکڑی دکھانے والے نوکر کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کا مستحق شیطان تھا، اور ہر وہ بندہ ہے جو ڈٹ کر اپنے رب کی نافرمانی کرے اور خم ٹھونک کر اس کے سامنے کھڑا ہو جائے۔ دوسرا سلوک وہ ہے جو اس وفادار بندے کے ساتھ کیا جاتا ہے جو محض "بھول" اور "فقدانِ عزم" کی وجہ سے قصور کر گزرتا ہے۔ اور پھر ہوش میں آتے ہی اپنے کیے پر شرمندہ ہو جاتا ہے۔ یہ سلوک حضرت آدم و حوا سے کیا گیا کیونکہ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ پکار اٹھے تھے۔

"اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور اگر تو ہم سے درگزر نہ فرمائے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔"

صرف معاف ہی نہیں کیا بلکہ آئندہ کے لیے راہ راست بھی بتائی اور اس پر چلنے کا طریقہ بھی سکھایا۔ آدمؑ نے توبہ کی اور اللہ نے قبول کر لی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آدمؑ اپنی نافرمانی پر عذاب کے مستحق نہ رہے۔ گناہگاری کا جو داغ ان کے دامن پر لگ گیا تھا وہ دھو ڈالا گیا۔ نہ یہ داغ ان کے دامن پر رہا، نہ ان کی نسل کے دامن پر اور نہ اس کی ضرورت پیش آئی کہ معاذاللہ! خدا کو اپنا اکلوتا بھیج کر نوعِ انسانی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے سولی پر چڑھوانا پڑتا۔ برعکس اس کے اللہ نے آدم علیہ السلام کی توبہ ہی قبول کرنے پر اکتفا نہ فرمایا، بلکہ اس کے بعد انھیں نبوت سے بھی سرفراز کیا تاکہ وہ اپنی نسل کو سیدھا راستہ بتا کر جائیں۔

زمین پر اتارا جانا بطور سزا نہیں تھا

اب جو جنت سے نکلنے کا حکم پھر دہرایا گیا، تو اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قبولِ توبہ کا یہ مقتضیٰ نہ تھا

کہ آدم کو جنت ہی میں رہنے دیا جاتا اور زمین پر نہ اتارا جاتا۔ زمین ان کے لیے دارالعذاب نہ تھی، وہ یہاں سزا کے طور پر نہیں آ بسائے گئے، بلکہ انھیں زمین کی خلافت ہی کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ جنت ان کی اصل جائے قیام نہ تھی، وہاں سے نکلنے کا حکم ان کے لیے سزا کی حیثیت نہ رکھتا تھا، اصل تجویز تو ان کو زمین ہی پر اتارنے کی تھی، البتہ اس سے پہلے ان کو امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا۔

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ حضرت آدم و حوا کو جنت سے اُتر جانے کا یہ حکم سزا کے طور پر دیا گیا تھا۔ قرآن میں متعدد مقامات پر اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور انھیں معاف کر دیا تھا۔ لہٰذا اس حکم میں سزا کا کوئی پہلو نہیں ہے، بلکہ یہ اس منشا کی تکمیل ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا تھا۔

زمین میں آزمائشی خلافت

آدمؑ اور ان کی اولاد کو مستقل خلافت پر مامور کرنے کے بجائے آزمائشی خلافت عطا کی گئی، اور آزمائش کے لیے ایک مدت (اجلِ مسمّٰی جس کا اختتام قیامت پر ہوگا) مقرر کر دی گئی۔ اس آزمائش کے دور میں امداد کے لیے معیشت کا سرکاری انتظام ختم کر دیا گیا۔ اب اپنی معاش کا انتظام انھیں خود کرنا ہے۔ البتہ زمین اور اس کی مخلوقات پر ان کے اختیارات برقرار ہیں۔ آزمائش اس بات کی ہے کہ اختیار رکھنے کے باوجود یہ اطاعت کرتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر "بھول" لاحق ہوتی ہے، یا تحریص و اطماع کے اثر میں آکر پھسلتے ہیں تو تنبیہ و تذکیر اور تعلیم کا اثر قبول کر کے سنبھلتے بھی ہیں یا نہیں؟ اور ان کا آخری فیصلہ کیا ہوتا ہے، طاعت کا یا معصیت کا؟ اس آزمائشی خلافت کے دوران میں ہر ایک کے طرزِ عمل کا ریکارڈ محفوظ رہے گا۔ اور یوم الحساب میں جو لوگ کامیاب نکلیں گے انھی کو پھر مستقل خلافت، اس دائمی زندگی اور لازوال سلطنت کے ساتھ جس کا لالچ دے کر شیطان نے حکم کی خلاف ورزی کرائی تھی، عطا کی جائے گی۔ اس وقت یہ پوری زمین جنت بنا دی جائے گی اور اس کے وارث خدا کے صالح بندے ہوں گے جنھوں نے آزمائشی خلافت میں طاعت پر قائم رہ کر، یا "بھول" لاحق ہونے کے بعد بالآخر طاعت کی طرف ہٹ کر اپنی اہلیت ثابت کر دی ہوگی۔

نسلِ انسانی کے لیے خدا کا مستقل فرمان

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ	"پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے،
تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا	تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے

هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (البقرہ - آیات ۳۸-۳۹)

کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔ اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے، وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔"

یہ نسلِ انسانی کے حق میں ابتدائے آفرینش سے قیامت تک کے لیے اللہ کا مستقل فرمان ہے اور اسی کو تیسرے رکوع میں اللہ کے "عہد" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسان کا کام خود راستہ تجویز کرنا نہیں بلکہ بندہ اور خلیفہ ہونے کی دوگونہ حیثیتوں کے لحاظ سے وہ اس پر مامور ہے کہ اس راستہ کی پیروی کرے، جو اس کا رب اس کے لیے تجویز کرے اور اس راستے کے معلوم ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو کسی انسان کے پاس براہِ راست اللہ کی طرف سے وحی آئے، یا پھر وہ اس انسان کا اتباع کرے، جس کے پاس وحی آئی ہو۔ کوئی تیسری صورت یہ معلوم کرنے کی نہیں ہے کہ رب کی رضا کس راہ میں ہے۔ ان دو صورتوں کے ماسوا ہر صورت غلط ہے بلکہ غلط ہی نہیں، سراسر بغاوت بھی ہے جس کی سزا جہنم کے سوا کچھ اور نہیں۔

دنیا میں تنگ زندگی کا مطلب

سورۂ طٰہٰ کی آیات ۱۱۷ تا ۱۱۹ میں تشریح ہے اس مصیبت کی جس میں جنت سے نکلنے کے بعد انسانوں کو مبتلا ہو جانا تھا۔ اس موقع پر جنت کی بڑی اور اکمل و افضل نعمتوں کا ذکر کرنے کے بجائے اس کی چار بنیادی نعمتوں کا ذکر کیا گیا۔ یعنی یہ کہ یہاں تمھارے لیے غذا، پانی، لباس، اور مسکن کا انتظام سرکاری طور پر کیا جا رہا ہے۔ تم کو ان میں سے کوئی چیز بھی حاصل کرنے کے محنت اور کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ اس سے خود بخود یہ بات آدم و حوا پر واضح ہوگئی کہ اگر وہ شیطان کے بہکاوے میں آکر حکمِ سرکار کی خلاف ورزی کریں گے۔ تو جنت سے نکل کر انھیں یہاں کی بڑی نعمتیں تو درکنار، یہ بنیادی آسائشیں تک حاصل نہ رہیں گی۔ وہ اپنی بالکل ابتدائی ضروریات کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے اور اپنی جان کھپانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ چوٹی سے ایڑی تک پسینہ جب تک نہ بہائیں گے، ایک وقت کی روٹی تک نہ پا سکیں گے۔ معاش کی فکر ہی ان کی توجہ اور ان کے اوقات اور ان کی قوتوں کا اتنا بڑا حصہ کھینچ لے جائے گی کہ کسی بلند تر مقصد کے لیے کچھ کرنے کی نہ فرصت رہے گی، نہ طاقت۔

دنیا میں تنگ زندگی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے تنگ دستی لاحق ہوگی۔ بلکہ اس کا مطلب

یہ ہے کہ یہاں اسے چین نصیب نہ ہوگا۔ کروڑپتی بھی ہوگا تو بے چین رہے گا۔ ہفت اقلیم کا فرمانروا بھی ہوگا تو بے کلی و بے اطمینانی سے نجات نہ پائے گا۔ اس کی دنیاوی کامیابیاں ہزاروں قسم کی ناجائز تدبیروں کا نتیجہ ہوں گی جن کی وجہ سے اپنے ضمیر سے لے کر گرد و پیش کے پورے اجتماعی ماحول تک ہر چیز کے ساتھ اس کی پیہم کشمکش جاری رہے گی جو اسے کبھی امن و اطمینان و مسرت سے بہرہ مند نہ ہونے دے گی۔

اوّلین سبق اور اس کی یاددہانی

۱۔ وہ بھولا ہوا سبق جسے قرآن یاد دلا رہا ہے، وہی سبق ہے جو نوعِ انسانی کو اس کی پیدائش کے آغاز میں دیا گیا تھا جسے یاد دلاتے رہنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا اور جسے یاد دلانے کے لیے قرآن سے پہلے بھی بار بار "ذکر" آتے رہے۔

۲۔ انسان اس سبق کو بار بار شیطان کے بہکانے سے بھولتا ہے۔ اور یہ کمزوری وہ آغازِ آفرینش سے برابر دکھا رہا ہے۔ سب سے پہلی بھول اس کے اوّلین ماں باپ کو لاحق ہوئی تھی اور اس کے بعد سے اس کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اسی لیے انسان اس کا محتاج ہے کہ اس کو پیہم یاددہانی کرائی جاتی رہے۔

۳۔ یہ بات کہ انسان کی سعادت و شقاوت کا انحصار بالکل اس برتاؤ پر ہے جو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے اس "ذکر" کے ساتھ وہ کرے گا، آغازِ آفرینش ہی میں یہ بات صاف صاف بتادی گئی تھی۔ آج یہ کوئی نئی بات نہیں کہی جا رہی کہ اس کی پیروی کروگے تو گمراہی و بدبختی سے محفوظ رہوگے، ورنہ دنیا و آخرت دونوں میں مبتلائے مصیبت ہوگے۔

۴۔ ایک چیز ہے بھول اور عزم کی کمی اور ارادے کی کمزوری جس کی وجہ سے انسان اپنے ازلی دشمن شیطان کے بہکانے میں آجائے اور غلطی کر بیٹھے۔ اس کی معافی ہو سکتی ہے بشرطیکہ انسان غلطی کا احساس ہوتے ہی اپنے رویے کی اصلاح کر لے، اور انحراف کی راہ چھوڑ کر اطاعت کی طرف پلٹ آئے۔ دوسری چیز وہ سرکشی اور سرتابی اور خوب سوچ سمجھ کر اللہ کے مقابلے میں شیطان کی بندگی ہے جس کا ارتکاب فرعون اور سامری نے کیا۔ اس چیز کے لیے معافی کا کوئی امکان نہیں۔ اس کا انجام وہی ہے جو فرعون اور سامری نے دیکھا۔ اور یہ انجام ہر وہ شخص دیکھے گا جو اس روش پر چلے گا۔ (باقی)